بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جو سلسلۂ گفتگو پیچھے سے چلا آ رہا ہے، اسی کے تحت کچھ باتیں اور!

ایک قابلِ غور سوال یہ ہے کہ پچھلے دس یا پندرہ برس میں ہمارے اندر کیا تغیرات واقع ہوئے ہیں؟ یعنی اوّلاً ذاتی دائرے میں ——— طرزِ فکر کے لحاظ سے، دلچسپیوں کی ترتیب کے لحاظ سے، سرگرمیوں کے محور کے لحاظ سے، دعوتی اور معاشی کاموں میں توازن کے لحاظ سے، عاداتِ مطالعہ کے لحاظ سے، معاشرتی مرتبے کے لحاظ سے، آسائش پسندی کے لحاظ سے، وھلمّ جرّا! اسی طرح اجتماعی دائرے میں۔

ہماری پسند و ناپسند کے معیارات میں فرق تو نہیں آیا؟ کچھ ایسی چیزیں تو نہیں جن کے لیے ہم کل تک دینی بنیادوں پر بڑا زور دیتے تھے اور اب ڈھیلے پڑ گئے ہیں؟ کچھ ایسی چیزیں تو نہیں جن کو کل ہم برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ اور اب یکایک انہوں نے ہماری زندگی میں جگہ بنا لی ہے؟ ہمارا بنیادی رویّہ یہ تھا کہ ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ زندگی میں ناجائز عناصر کیا کیا اور کہاں کہاں ہے تاکہ اس سے جلد نجات پائی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم سب میں یا ہماری غالب اکثریت میں یہی رویّہ کام کر رہا ہے یا اب یہ نقطۂ نظر بھی نمودار ہو رہا ہے کہ مفاد اور عادات جس شکل میں بھی زندگی کے نقشے میں جگہ پا چکے ہوں اُن کے لیے گنجائشِ جواز تلاش کی جائے؟

لوگوں سے میل جول، دعوتی رابطوں، افراد سے افہام و تفہیم کی گفتگوؤں، لٹریچر کی دست بدست اور خانہ بہ خانہ تقسیم کا معاملہ کیسا ہے؟ بات پہلے ہی کی طرح ہے یا کچھ فرق ہے؟

آپ کے مال میں سے انفاق فی سبیل اللہ کا تناسب کیا ہے؟ مساجد سے تعلق کتنا ہے؟ قرآن کی تلاوت اور اُسے سمجھنے کی کوشش کے ساتھ احادیث کا علم کس رفتار سے بڑھ رہا ہے؟ آپ کے معمول میں نمازوں اور دوسرے خاص اوقات کی دُعاؤں اور اذکار میں سے کیا کیا اپنی جگہ قائم ہے؟ کچھ مدت پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے یا کمی؟

یہ احتساب (STOCK TAKING) روزانہ بھی ہونا چاہیے، کسی خاص مہماتی دَور کے بعد بھی، اور کبھی کبھار کئی برس کا جائزہ اکٹھا بھی لینا چاہیے۔

اس خاموش خود تنقیدی سے آدمی کو اپنے بہت سے اسرار کا پتہ چل جاتا ہے۔ ضعف و استقامت کا اثر ہو تو وہ معلوم ہو جاتا ہے، تاب و تواں میں اضافہ ہوا ہو تو اُسے بھی آدمی جان لیتا ہے۔ بہت سی خود فریبیوں سے نکل آتا ہے، اور اگر وہ چاہے تو اپنی داعیانہ شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کی وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت مرمت کر کے مضبوطی حاصل کر لیتا ہے۔

خدا پرست آدمی کو ہمیشہ اپنی گھات لگائے رکھنا چاہیے۔ اپنے باطن سے، اپنی نیتوں سے، اپنی عادات سے، اپنی دلچسپیوں سے، اپنی سرگرمیوں سے غفلت ویسا ہی نقصان دیتی ہے جیسے کوئی مالی اپنے چمن کی دیکھ بھال نہ کرے تو اُس کی کیاریاں خراب ہو جائیں گی، مینڈیں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔ پودے اس بے ڈھنگ طریق سے بڑھیں گے کہ جنگل کا سماں ہو گا۔ بعض قیمتی اور نازک پودے سوکھ کر ختم ہو جائیں گے۔ مولیشی اور پرندے شاخوں اور پھلوں اور پھولوں کا ستیاناس کر دیں گے۔ سبزہ بے گانہ ہو جائے گا، اور جگہ جگہ نرسل سر اُٹھائیں گے۔

پس باہر کی دُنیا کے احوال کا معاملہ بعد میں آتا ہے۔ سچا خدا پرست اپنے اندر کی دُنیا کو درست اور صحت مند اور خوش آئند رکھتا ہے تو اُس کے نتیجے میں وہ باہر کی دُنیا سے بھی بخوبی نمٹ لیتا ہے۔ کہاوت ہے کہ "جان ہے تو جہان ہے"۔ مگر ایک مسلمان یوں سوچتا ہے کہ "ایمان ہے تو جہان ہے"۔ یہ جہان ہو کہ وہ جہان، دونوں میں خیر و خوبی اگر حاصل ہوتی ہے تو ایمان سے، ایمان نہیں تو سب کچھ ویران ہے اور عذابِ جان!

پارلیمانی سیاست کاری میں ساری توجہ حالات کے مدّ و جزر پر ہوتی ہے۔ کون قیادت پر آگیا ہے؟

کسے وزارت مل گئی ؟ کیا قوانین پاس ہو گئے ؟ ٹیکس کتنے لگا دیے گئے ؟ داخلی اور خارجہ پالیسیاں کیا ہیں ؟ وغیرہ۔

حکومتی گروہ، حکومتی اور قانونی اور پالیاتی تبدیلیوں کی توجیہہ کر کے بتاتا ہے کہ یہ فلاں فلاں وجوہ سے ضروری تھیں، اور اُن میں یہ یہ فوائد ہیں۔ دوسری طرف سے اپوزیشن ہر تبدیلی میں کوئی نہ کوئی خلل نکال کے دکھاتی ہے اور اُسے ہدفِ تنقید بناتی ہے بلکہ حکمران پارٹی پہ اچھے خاصے حملے کرتی ہے۔

اسلامی دعوت و تحریک بھی ضرورت پڑنے پر پارلیمانی مشغلہ اختیار کر لیتی ہے ——— حکومتی سطح پر یا اپوزیشن کی سطح پر۔ مگر وہ اپنے اصول و مقاصد کو برتر رکھ کر سوچتی ہے۔ نہ حکومت کی اندھی حمایت، نہ اپوزیشن کے دوسرے عناصر کی ہر بات پر آمین۔ اسی طرح حکومت کی مجنونانہ مخالفت نہ اپوزیشن والوں کی حمد و ثنا اور تائید۔ اُدھر کوئی بھلائی ہو تو اُس کا اعتراف، اِدھر صحیح اقدام ہو تو اِدھر تحسین۔ اسی طرح اُس سطح پر غلط کام ہوں تو اُن کے خلاف احتجاج، اور اس سطح پر غلط آراء یا منصوبے سامنے آئیں تو ان سے اختلاف و برأت۔

بہرحال پارلیمانی سیاست واقعاتی مدوجزر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

لیکن اسلامی دعوت ہر قسم کے واقعاتی مدوجزر سے قطع نظر، اور ہر قسم کے واقعاتی مدوجزر کے ساتھ ساتھ رواں رہتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ پچھلے ادوار میں ہماری توجہات کو واقعاتی مدوجزر نے اپنی طرف اس درجہ منعطف کیے رکھا ہے کہ ہماری ساری گفتگوئیں، بیانات، اعلانات، خط و کتابت انہی کے حوالے سے ہوتی رہی ہے اور انہی کے حل اور توڑ سوچے جاتے رہے ہیں، متوازی طور پر جو زور کارِ دعوت پر دیا جانا تھا وہ نہیں دیا جا سکا ہے۔

یہ فرق اس حقیقت سے واضح ہو سکے گا کہ پہلے ادوار میں ہم اپنی اصل دعوت زور دے کر تفصیل سے پیش کرتے تھے اور لوگ اس سے متاثر ہوتے تھے، پھر ہم اس کے تقاضوں کو احوال و مقامات پر منطبق کر کے بتاتے تھے کہ کس معاملے میں کیا ہونا چاہیے۔ اب نئے ادوار میں ہم کسی وقتی صورتِ حالات کو اصل مدارِ بحث بنا کر سوچتے اور بات کرتے ہیں اور اس کے متعلق دعوت اور اُس کے

تقاضوں کو بغیر کسی وضاحت کے اپنے ہی ذہن میں منطبق کر کے اور اُس کے نتائج نکال کر اظہارِ خیال کر دیتے ہیں۔ یعنی اب ہمارا طریقہ لوگوں کو اسلام کی اصل دعوت کی طرف کھینچنے کا نہیں، بلکہ وقت کے مسائل اور اُن کے حل کی طرف کھینچنے کا ہے۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہو جائے تو اسلام کا عَلَم بلند ہوگا اور فلاں کو روکا جائے تو اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ مگر اب ہم اسلام کی اساسی تعلیم کو لوگوں میں ایسے طریق سے نہیں پھیلاتے کہ وہ خود یہ بات سمجھنے کے قابل ہو جائیں کہ اسلام کی قوت کس صورت میں ہے اور اس کا ضعف کس صورت میں۔

میرا کہنا یہ ہے کہ پارلیمانی سیاست ہو (جس کا فی الحال ناطقہ بند ہے)، یا وقتی حالات کے متعلق غیر پارلیمانی طرز کا تعرض، یہ اسلامی تحریک کے ضمنی مشاغل ہو سکتے ہیں جن کا اصل مدّعا دعوت ہی کے لیے نئے میدان پیدا کرنا اور اُسے تقویت دینا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے واقعاتی مدّ و جزر کے دوران میں ہماری اصولی دعوتِ اسلام ٹھیک اسی طرح جاری رہنی چاہیے۔ جیسے پہلے تھی۔ یعنی معلّمانہ طریق سے لوگوں تک اسلامی تعلیمات کو مؤثر انداز میں پہنچانا، اُن کو دل سے دینی حقائق کا قائل کرنا، اُن کے باطن میں اسلامی نقشے پر تبدیلی کا رضاکارانہ جذبہ پیدا کرنا اور اُن کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ اُبھارنا، اُن کو تعاون علی البرّ اور عدم تعاون علی الاثم کے ذوق سے مالا مال کرنا اور اُن کو غلبۂ دین کی جدوجہد کا سپاہی بنا دینا۔ یہ ہے کارِ دعوت۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم اس بنیادی کام میں اپنے ہدف سے پیچھے نہ رہ گئے ہوں۔ اور رفتار کے لحاظ سے سُست گام نہ ہو گئے ہوں۔

میرے نزدیک کفار کا دیس ہو کہ مسلمانوں کا، سیاسی دَور ہو یا غیر سیاسی، حالتِ جنگ ہو یا حالتِ امن، اساسی دعوت ہر حالت میں جاری رہنی چاہیے۔

اگلے دن مَیں ایک تقریر سُن رہا تھا۔ چند روز بعد ایک اور تقریر سُنی۔ دونوں تقریریں مختصر پارلیمنٹری مجالس میں ہوئیں۔ اس غیر سیاسی دَور میں اگر آلوؤں کی کاشت پر، یا عالمی یومِ اطفال کے متعلق بھی کوئی تقریر سُننے کا موقع مل جائے تو ایسا ہی ہے جیسے سُوکھے میں کوئی چھوٹی سی بدلی یکایک نمودار ہو اور چار چھینٹے ڈال جائے۔

دونوں تقریروں میں دینی جذبات کی جھلک نمایاں تھی۔ مگر دونوں کا رُوئے سخن احوالِ زمانہ

کی لہروں کی طرف تھا۔ ایک میں جوش بہت زیادہ تھا۔ مگر ہوش بس اس حد تک جتنا چائے کی پیالی میں دودھ ہوتا ہے۔ دوسری میں جوش بھی بہت زیادہ تھا اور ہوش بھی خاصا! دونوں کی قدر مشترک پرزور جوشیلا پن تھا۔

جوشیلی بات کے لیے الفاظ بھی خاص طرح کے چاہییں، اور لہجہ بھی مناسب اسلوب کا۔ یہ دونوں خوبیاں دونوں طرف موجود تھیں۔

بالعموم جوشیلے الفاظ اور جوشیلے لہجے کو قوت کی علامت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جوشیلی تقریریں ہوں یا جلسے یا جلوس یا پوسٹر یا بیانات، یہ ساری چیزیں اظہارِ قوت یا نمائشِ قوت کی تعریف میں آتی ہیں۔

اظہارِ قوت اور نمائشِ قوت کا بھی ایک خاص اثر ہوتا ہے، مگر اصل اثر آفریں چیز خود قوت ہے۔ نمائشِ قوت سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مغالطے دیے جا سکتے ہیں اور کسی معرکۂ مسلسل میں جزوی طور پر کبھی مغالطہ انگیزی بھی فائدہ دے جاتی ہے۔ مگر فی الحقیقت مستقل دار و مدار اصل قوت پر ہوتا ہے کہ وہ کتنی ہے؟

دین کی بات ہو یا سیاست کی، اصولاً قوت اُس اثر کا نام ہے جو کسی دعوت یا پروگرام میں پایا جاتا ہو۔ کتنے لوگ اُسے سمجھتے ہیں؟ کتنے پوری طرح سمجھ کر اُسے قبول کر چکے ہیں؟ کتنے اُس کا تھوڑا بہت اثر لے کر اُس کی حمایت کرتے ہیں؟ پیغام دینے والوں کو کتنے لوگ جانتے ہیں اور اُن سے محبت کرتے ہیں؟ پکارا جائے تو کتنے لبیک کہتے ہیں؟ تعاون کی ضرورت ہو تو کتنے اپنی قوتوں، اوقات اور اموال کی قربانیاں خوشی خوشی دیتے ہیں؟ کتنے کس کام کو اپنا کام سمجھتے ہیں اور کسی حلقے کو اپنا حلقہ مانتے ہیں؟ دن رات کی گفتگوؤں اور بحثوں میں کتنے لوگ مخالفین کو دلائل سے قائل کرنے یا اُن کے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں؟ اور ایسے لوگ معاشرے کے مختلف اداروں اور دفتروں اور پیشوں میں کس تناسب سے پائے جاتے ہیں؟

اس معیار پر حقیقی قوت جتنی موجود ہو اُس کو اگر محض جوشیلے پن یا فرسٹریشن کے ذریعے دس گنا زیادہ کر کے پیش کیا جائے تو یہ بڑا بھاری عدم توازن ہے۔ دنیا میں اگر کوئی سعی و جہد کرتے ہوئے آدمی اس عدم توازن سے کام لے تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔

مختصر بات یہ ہے کہ دعوتوں، نظریوں اور تحریکوں کی اصل قوت اساسی سرمائے کی طرح ہوتی ہے اور اس کے مظاہر گویا اس سرمائے سے پیدا ہونے والی کاروباری سرگرمی کے مترادف ہیں۔

بڑی غلط صورت ہوگی، اگر کسی نظریے کے علمبردار اپنے حقیقی سرمایے میں اضافہ کرنے پر تو بہت کم توجہ دیتے ہوں، اور مارکیٹ میں یہ دکھانے کی کوشش کریں کہ ہم ارب پتی ہیں۔ حقیقی سرمایہ تو وہ وہی رہے جو دس برس پہلے تھا، اور بازار کی مسابقت مجبور کر دے کہ کاروباری سرگرمی پہلے سے بہت زیادہ دکھائی جائے تو بزنس مین کس بحران سے دوچار ہو جائے گا۔

کاش کہ بازارِ حق کا بزنس مین بہت زیادہ فکر اپنے حقیقی سرمایے میں اضافے کی کرے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ معاشرے میں ہمہ گیر تبدیلی جب آتی ہے تو خواہ وہ انتخابی راستے سے آئے یا انقلابی (یعنی ہجومی سیاست) کے راستے سے، وہ ہمیشہ حقیقی قوت کے معیارِ مطلوب تک پہنچ جانے کی صورت میں آتی ہے۔ بغیر اس کے آ بھی جائے تو اس کے برگ و بار بدل جاتے ہیں۔

خالص نظریاتی بات یہ ہے کہ سیاست، جو بجائے خود ضروری ہے، ایک طرح کی محاذ آرائی ہوتی ہے۔ ہم خیال لوگ ایک طرف اور مخالفین ایک طرف۔ دونوں طرف سے بیان بازی، دونوں طرف سے جوڑ توڑ، دونوں طرف سے چالیں اور ان کی کاٹ۔ اس مشغلے کا مزاج جنگی ہے۔ سیاست کے اسٹیج سے آدمی نرم اور ڈھیلی ڈھالی بات نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح کا انداز اختیار نہیں کر سکتا کہ "ممکن ہے غلطی ہماری ہو، مگر ہمیں صحیح یہی محسوس ہوتا ہے"۔ کھینچا تانی جب بڑھتی ہے تو نفرت کی اسپرٹ کام کرنے لگتی ہے۔ آپ سیاسی اسٹیج سے جسے حریف قرار دے کر اس پر گولہ باری کرتے ہیں، پھر اسی سیاسی اسٹیج سے اسے دلگداز انداز میں دعوتِ اسلامی نہیں دے سکتے، دین بھی تو بعثت ہے۔

بخلاف اس کے دعوتِ حق کی روح محبت و خیر خواہی ہے وہ ابرِ رحمت کی مانند عام ہے، اس کا مخاطب ہر کوئی ہے، خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، خواہ وہ مخالف و معاند ہی کیوں نہ ہو۔ دعوت کی بات الیکشن کی طرح دو ٹوک نہیں ہوتی کہ مخاطب فلاں تاریخ تک ادھر یا ادھر ہونے کا فیصلہ کر لے بلکہ دعوت کا عمل تا دیر آہستہ آہستہ جاری رہتا ہے۔ ایک آدمی کے سامنے

سب جتنی بات کرنی چاہیے، اُتنی کی جاتی ہے۔ بقیہ گفتگو کے لیے دوسرا موزوں لمحہ تلاش کیا جاتا ہے۔ ایک انداز گفتگو اگر کارگر نہ رہے تو دوسرا آزمایا جاتا ہے۔ قسط بہ قسط اثر اندازی کی کوشش ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ خدا فراموش لوگ از خود نماز کے لیے آنے لگتے ہیں۔ فلم بینوں کو درسِ قرآن میں شمولیت کا شوق ہو جاتا ہے۔ حرام خوار افراد رزقِ حلال کے لیے سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ بے پردہ عورتوں میں از خود پردہ داری کا رجحان اُبھر آتا ہے۔ قاتل اور ڈاکو تائب ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی دلچسپیاں بدلنے لگتی ہیں۔ اُن کی دوستیوں اور دشمنیوں کے پیمانے تبدیل ہو جاتے ہیں جو لوگ نقیبانِ حق کو گالیاں دیتے تھے وہ اُن کے لیے دُعائیں کرنے لگتے ہیں۔

کیا کارِ دعوت میں کچھ ایسے واقعات آپ کو پیش آئے؟ یا کسی دوسرے کے کام کے ایسے نتائج آپ نے دیکھے؟ کیا آج ایسے عجائبات پیدا کر دکھانے کا جذبہ آپ میں ہے؟

مَیں کہتا ہوں کہ سیکڑوں سیاسی کامیابیاں اور ہزاروں سیاسی فتوحات اِس جدوجہد پر قربان جس کے نتیجے میں خدا کے بندے، نفس اور ماحول کی قوتوں کی بندگی سے نکل کر صحیح معنوں میں خدا کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہی اقامتِ دین کی جدوجہد کی اصل قوت ہوتے ہیں اور اس اصل قوت میں اضافہ کرنے کی مہم ہر قسم کے حالات میں جاری رہنی چاہیے۔

دین و سیاست کو جمع کرنے یا انتخابی اور دعوتی سرگرمیوں کو بیک وقت لے کے چلنے کا تجربہ اتنا مشکل ہے کہ ماضی میں ہمارے یہاں دونوں کاموں کے لیے دو دائروں میں الگ الگ قوتیں نمودار ہو گئی تھیں۔ ایک طرف بادشاہ، وزراء اور امراء تھے جو فوج کشی کر کے فتوحات کرتے اور سلطنتیں چلاتے تھے، دوسری طرف صوفیاء تھے جو ساری نزاعات سے کنارہ کش ہو کر تمام انسانوں کے لیے یکساں خیر خواہ بنتے اور اُن کو قبولِ اسلام اور اطاعتِ اسلام کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ اُن کی فتوحات تھیں۔

اب یا تو تھک ہار کر یہ کہیے کہ دونوں کام الگ الگ ہونے چاہییں یا دونوں کاموں کو بیک وقت کرنے میں جس بصیرت اور توازن اور محنت کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔

(باقی)